بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

چند روز ہوئے ملک کے ایک مشہور صحافی ـــ جنہیں جماعت اسلامی کے ہمدرد نقادوں کے زمرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے ـــ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے علیک سلیک کے بعد ذرا دل گیر ہو کر یہ سوال کیا کہ کیا جماعت اسلامی کی ترقی کی رفتار تشویشناک حد تک گر تو نہیں گئی؟ میں نے ان سے عرض کیا کہ میرا یہ منصب مقام نہیں کہ کسی اخبار نویس کو جماعت کے بارے میں کوئی بیان دے سکوں البتہ آپ اگر جماعت کے ایک ادنیٰ کارکن سے اپنی ذاتی حیثیت میں تاثرات معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پھر میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ خدا کے فضل سے جماعت کی رفتارِ کار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ میری یہ بات سن کر وہ کچھ خاموش سے ہو گئے مگر ان کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ وہ میری اس گزارش کو یکے از وابستگانِ جماعت اسلامی کی محض خوش فہمی خیال کر رہے ہیں۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا: ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر جماعت کے کاموں میں وہ گہما گہمی نظر نہیں آتی جو اس وقت ہونی چاہیئے۔ مجھے اگرچہ ان کے اس مشاہدے سے بھی اتفاق نہ تھا مگر میں نے ان کی اس رائے کی تردید مناسب نہ سمجھی البتہ جماعت کی رفتارِ کار کا صحیح صحیح جائزہ لینے کے لیے بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف اُن کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں میں نے ان کی خدمت میں یہ گزارش کی: آپ ایک قافلے کو دریا عبور کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو آپ اُس کی رفتار کا ایک اندازہ لگا لیتے ہیں لیکن ایک حصہ عبور کر لینے کے بعد قافلہ ایک ایسے مقام پہ آجاتا ہے جہاں دریا کا بہاؤ بڑا خوفناک، اس کی لہریں بڑی تند و تیز اور گرداب بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دریا کی تہہ میں اول تو کوئی ایسی زمین نہیں ملتی جہاں آسانی سے قدم جمائے جا سکیں اور اگر کہیں ملتی بھی ہے تو وہ دلدل ہوتی ہے جس میں ہر لمحہ پاؤں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ ان نامساعد حالات میں اگر کوئی دریا عبور کرنے والا قافلہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہنے کے بجائے اس کی تند و تیز

موجوں کی نذر ہونے کے بجائے اور گرداب میں گرفتار ہونے کے بجائے اپنی جگہ پر ڈٹا رہتا ہے تو میرے نزدیک یہ اس کی رفتار میں کمی کی علامت نہیں بلکہ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس قافلہ میں اتنی ہمت، جرأت اور قوت موجود ہے کہ بپھرے ہوئے دریا کی کف بدہن موجوں کا مقابلہ کرکے اپنے قدم آگے بڑھا سکے۔ انسانیت کے جو قافلے ان صفات سے متصف نہیں ہوتے سیلابِ زمانہ کی خوفناک موجیں انہیں خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہیں اور ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔

کسی بااصول جماعت یا انقلابی تحریک کی رفتارِ کار کو جانچنے کے لیے صرف یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اُس نے ملک کی سیاسی سطح پر کتنے حباب اٹھائے ہیں اور کس نوعیت کا تموج برپا کیا ہے بلکہ اس امر کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ اس جماعت یا تحریک نے معاشرے کے موثر طبقات کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو کہاں تک بدلا ہے اور انہیں عمل کی کونسی نئی راہوں پر گامزن کیا ہے۔ بااصول جماعتیں اور انقلابی تحریکیں سرکش گھوڑوں کی طرح آگے نہیں بڑھتی جاتیں بلکہ شمعِ علم و عرفان کی طرح لوگوں کے قلب و دماغ کو ایک خاص انداز سے روشن کرتی ہیں۔ علم انسان کے اندر ایک رفتار اور ایک ہی نہج سے سرائت نہیں کرتا بلکہ مختلف منزلوں پر اس کی رفتار اور نہج میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس کی سب سے پہلی منزل یہ ہوتی ہے کہ انسان کے اندر یہ احساس بیدار ہو جائے کہ وہ علم سے عاری ہونے کی وجہ سے ایک عظیم دولت سے محروم ہے۔ اِس کے بعد اُس کے اندر اس کے حصول کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ بڑے جذب و شوق سے کسی شعبۂ علم کی چند بنیادی باتیں اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر یکایک وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا ذہن مزید معلومات قبول کرنے سے ابا کر رہا ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی علمی ترقی کی رفتار رک گئی ہے اور اس کے لیے مزید علم حاصل کرنا بالکل ناممکن ہو گیا ہے۔ مگر یہ اس کی غلط فہمی ہوتی ہے۔ اس منزل پر گو اس کی معلومات میں اضافہ نہیں ہوتا مگر اس نے جو معلومات پہلے حاصل کی ہوتی ہیں اُن کے اندر اس کا ذہن ایک معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پیدا کرکے انہیں اس کے لیے مفید اور کارآمد بناتا ہے۔ اور دماغ کا یہ کام پہلے کام سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

جن مفکرین نے ٹھوس مقاصد کی تکمیل کے لیے اٹھنے والی تحریکات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے ان

کے نزدیک ان تحریکات کو کم و بیش چھ منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلی منزل یہ ہوتی ہے کہ کوئی تاریخ ساز انسان انقلابی دعوت پیش کرتا ہے اور اس دعوت کی روشنی میں وہ رائج الوقت نظاموں اور نظریات کا اِس طرح جائزہ لیتا ہے کہ اس کی دعوت اور ان نظاموں اور نظریات کے مابین جو عظیم فرق ہے اُس کے خطوط بالکل نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اِس سے سوچنے سمجھنے والے دماغوں کے اندر ایک ہلچل پیدا ہوتی ہے اور وہ نئی دعوت اور اس کے فکری و عملی مضمرات پر غور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر اس دعوت کو ایک تحریک کی شکل دینے کے لیے چند سر پھرے آگے بڑھتے ہیں۔ السابقون الاولون کا یہ گروہ انتہائی مخلص ہوتا ہے اور کسی بڑی سے بڑی قربانی سے گریز نہیں کرتا۔ اِس گروہ کے افراد کی سیرتیں بڑی پختہ اور عزائم بڑے بلند ہوتے ہیں ان کی کاوشوں سے دعوت تحریک میں ڈھلتی ہے اور انقلاب کا قافلہ آگے بڑھتا ہے۔ پھر یہ دعوت اور تحریک عوام اور وقت کے غالب نظاموں کی توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔ اِس مرحلہ پر ایک طرف تو انقلاب کے خواہاں افراد اس کی طرف کھنچتے ہیں اور دوسری طرف اس کی مخالفت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے مگر نہ تو لوگ گروہ در گروہ اس میں شریک ہوتے ہیں اور نہ مخالفت منظم اور مضبوط ہوتی ہے۔ انقلاب کا یہ قافلہ چند قدم آگے بڑھ کر بظاہر رکتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر اس کی یہ وقتی رکاوٹ اس کے مستقبل کے لیے بڑی ضروری ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک مقام پر رک کر اپنے ان ہمسفروں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے جو سست روی کی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنی صفوں کو پھر سے نئے تقاضوں کے تحت ترتیب دیتا ہے اور آنے والے حالات کا جائزہ لے کر اپنے آپ کو نئے سفر کے لیے تیار کرتا ہے۔ یہ مرحلہ اس قافلے کے لیے فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ اِس دوسری منزل سے جب تحریک اپنے قدم آگے بڑھاتی ہے تو پھر جوشیلے اور متحرک لوگوں کی ایک معقول تعداد اس کے ساتھ آشامل ہوتی ہے۔ اس مرحلہ پر ہوش و خرد اور جذبہ و جنون ایک دوسرے کے ہم رکاب ہوتے ہیں اور تمام مخالف قوتیں اس قافلے کے وجود کو اپنے لیے خطرے کا چیلنج سمجھ کر اس کے خلاف صف آرا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں غیر منظم تصادم کے واقعات بھی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ مرحلہ تحریک کے علمبرداروں کے لیے اسی وجہ سے انتہائی تدبر اور دیدہ وری کا طالب ہوتا ہے کہ اس میں مخلص کارکنوں کے ساتھ مفاد پرستوں کی بھی ایک معقول تعداد شامل ہو چکی ہوتی ہے۔ ان مفاد پرستوں کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ اُن طالع آزماؤں پر مشتمل ہوتا ہے جو محض اِس توقع پر اس کا ساتھ دینا شروع کر دیتے ہیں کہ تحریک کی کامیابی سے انہیں چند

دنیوی مفادات حاصل ہو سکیں گے۔ اور دوسرے وہ مفاد پرست جو عوام میں اس کی بڑھتی ہوئی ساکھ سے فائدہ اٹھانے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ ان مفاد پرستوں کی علامت یہ ہے کہ یہ پوری یکسوئی کے ساتھ اور اردو محاورے کے مطابق کشتیاں جلا کر اس میں شریک نہیں ہوتے بلکہ اس کے ساتھ اپنی گوناگوں وابستگی کے دعوے کے باوجود دوسرے گروہوں اور دوسری جماعتوں سے بھی نہایت ہی "خوشگوار تعلقات" قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ تعلقات اور وابستگیاں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا کردار تحریک کے کارکنوں اور خادموں کا سا نہیں ہوتا بلکہ سرپرستوں کا سا ہوتا ہے اور اس گروہ میں زیادہ تعداد معاشرے کے صاحبِ حیثیت اور نمایاں لوگوں کی ہوتی ہے یعنی بڑے بڑے جاگیردار، کارخانہ دار، تجار، اونچی علمی شخصیتیں، ماہرینِ قانون، سرکاری عہدیدار اور سیاسی و مذہبی رہنما۔ اس ضمن میں یہ بات البتہ ذہن نشین رہے کہ تحریک سے محبت کا دعویٰ کرنے والے یہ نمایاں افراد سارے کے سارے غیر مخلص نہیں ہوتے بلکہ ان کی ایک اچھی خاصی تعداد اپنے اس دعوے میں مخلص بھی ہوتی ہے۔ ان میں سے جن لوگوں کے پاس روپے پیسے کی فراوانی ہوتی ہے وہ روپے پیسے سے تحریک کی مدد کرتے ہیں، اہلِ علم علمی سطح پر اس سے قوت بہم پہنچاتے ہیں اور دینی رہنما، دینی طبقوں کی طرف سے ہونے والی یلغار کا مقابلہ کرنے میں کسی حد تک تحریک کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان حضرات کی خدمات اپنی جگہ کتنی قابلِ قدر ہی سہی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی یہ ساری خدمات سرپرستی کے دائرے سے آگے نہیں بڑھتیں اور ان میں سے بہت کم افراد کارکنوں کی سطح پر اتر کر کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کے یوں تو متعدد وجوہ ہیں مگر ان میں دو وجوہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ دنیوی مفادات اور جاہ و جلال کے اعتبار سے یہ معاشرے میں جس اونچے مقام پر فائز ہوتے ہیں وہ مقام انہیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ کھل کر اور پوری یکسوئی کے ساتھ تحریک کا ساتھ دیں۔ ان کے مفادات اور ان کا بلند مرتبہ و مقام انہیں کارکنوں کے زمرہ میں شامل ہو کر تحریک کی خدمت کرنے کی راہ میں ہمیشہ حائل ہوتا ہے۔ دوسرے خود ان کی اپنی انا بھی انہیں اس کام سے باز رکھتی ہے۔ وہ یہ بات اپنے مرتبہ سے فروتر سمجھتے ہیں کہ کسی تحریک کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہو کر اور اپنے آپ کو اس کے نظم کا پوری طرح پابند بنا کر اس کے لیے کوئی کام کر سکیں چنانچہ اس طبقہ کے جتنے ہمدردوں اور قدر دانوں سے راقم الحروف کو ملنے کا اتفاق ہوا ہے ان کی باتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بہتر مالی و معاشرتی حیثیت، علمی غرور، پندارِ تقویٰ اور معاشرے میں غیر معمولی اثر و رسوخ انہیں تحریک سے

پوری طرح وابستہ ہونے میں مانع ہے۔ ان میں سے ہر فرد اپنے آپ کو اتنا اونچا اور بلند سمجھتا ہے کہ کسی دوسرے کی اطاعت اور پیروی کرنا اسے مشکل دکھائی دیتا ہے اس لیے یہ افراد تحریک کی تھوڑی بہت سرپرستی کرنے کے لیے تو تیار ہو سکتے ہیں مگر اس کے ساتھ وابستگی میں یکسو نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ تحریک کی قوت کا اصل سرچشمہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو خواہ علمی اور معاشرتی حیثیت میں ان کی بہ نسبت کہیں زیادہ فروتر ہوں مگر تحریک کے لیے سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں ـــــ اس مرحلہ پر کسی جماعت کے اندر تین گروہ کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انتہائی مدبر اور مخلص اور عزم و یقین کے حامل افراد جو سب سے پہلے کسی انقلابی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ جوشیلے اور سرگرم افراد جو دعوت کے کام کو ولولہ و ہمت کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔ ایسے مفاد پرست جو اس سے کسی حد تک وابستہ ہو کر دنیوی مفادات حاصل کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں اور ایسے با اثر مخلص سرپرست جو اسے ایک حد تک قوت تو بہم پہنچاتے ہیں مگر اس کا پوری طرح ساتھ دینے پر تیار نہیں ہوتے۔

دنیا کی ہر تحریک جب اس منزل میں داخل ہوتی ہے تو اسے جہاں باہر کی ہر آن بڑھتی ہوئی مخالفتوں اور مخاصمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں داخلی طور پر اس کے لیے بے شمار مسائل پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں ایک طرف جوش و ہوش کے مابین کھینچا تانی شروع ہوتی ہے اور دوسری طرف ہمدرد قسم کے بارسوخ سرپرست اپنے مخصوص مصالح اور مخصوص مزاج کے پیش نظر تحریک کو ایک ایسی راہ پر لیجانے کی کوشش کرتے ہیں جس پر عام کارکن گامزن ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ ان کے مشوروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ بسا اوقات انہیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس میں وہ کسی حد تک حق بجانب ہوتے ہیں کیونکہ جو عافیت کوش صرف ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کا نظارہ کرنے کے عادی ہوں وہ ان لوگوں کی دقتوں اور مصائب کو نہیں سمجھ سکتے جو طوفان کا مقابلہ کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ اپنی مشکلات کا وہ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں اس لیے ساحل پر کھڑے رہنے والے ان خیر خواہوں کی باتوں کو وہ توجہ سے نہیں سنتے مگر تحریک کی عوامی حیثیت اسے ان خیر اندیشوں کے مشوروں کو یکسر نظر انداز کرنے میں بھی مانع ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی تحریک کے کارکنوں کی ذہنی یکسوئی متاثر ہونے لگتی ہے اور اس کی رفتار میں بظاہر فرق محسوس ہونے لگتا ہے مگر یہ عارضی کیفیت ہوتی ہے اور تھوڑی سی محنت اور تجربہ کے بعد تحریک کے قائدین کو اس امر کا اندازہ

ہو جاتا ہے کہ ان سرپرستوں کی کن باتوں کو وہ قبول کر سکتے ہیں اور کن باتوں کو نہیں، اور بالآخر مسترد کرنا ہے۔ چنانچہ ان سرپرستوں کے تجربات سے کسی قدر فائدہ اٹھاتے ہوئے قافلہ نئے عزم کے ساتھ رواں دواں ہو جاتا ہے۔

پھر تحریک میں ایک قسم کی داخلی آویزش اس مقام پر بھی شروع ہوتی ہے جہاں جوش، ہوش کے اثر سے آزاد ہو کر آگے بڑھنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ ہم پہلے یہ واضح کر چکے ہیں کہ تحریک کے دوسرے مرحلے میں ہوش و جوش ایک دوسرے کے ہم رکاب ہو کر چلتے ہیں، بلکہ جوش اپنی عنان ہوش کے ہاتھ میں دے کر اپنے آپ کو آگے بڑھاتا ہے تاکہ وہ کسی غلط راہ پر نہ چل پڑے۔ جوش کی عملی میدان میں کارکردگی چونکہ زیادہ دکھائی دیتی ہے اس لیے اسے جلد ہی اپنی قوت اور کامرانیوں کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ ہوش کی گرفت سے آزاد ہو کر جولانیاں دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ خرد قافلے کو اعتدال اور حزم و احتیاط کے ساتھ آگے بڑھانے کے منصوبے بناتی ہے اور راہ میں جو موانع حائل ہوں انہیں حکمت اور تدبر کے ساتھ دور کرنے کی سعی کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جوش و جنون تحریک کو طوفان کی صورت میں سرگرم عمل دیکھنا چاہتے ہیں اور اس بات کے لیے کوشاں ہوتے ہیں کہ جو مسافت کسی انقلابی قافلے کو سالوں میں طے کرنی ہے وہ دنوں میں طے کر کے منزلِ مقصود پر پہنچ جائے۔ جوش و جنون کا علمبردار کسی تحریک کا نوجوان طبقہ ہوتا ہے اور چونکہ اس طبقہ میں کام کرنے کی قوت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اس لیے تحریک پر آہستہ آہستہ یہ طبقہ غالب آنے لگتا ہے اور اگرچہ قیادت اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی لیکن عملاً بات زیادہ اسی کی چلتی ہے اور اگر ہوش، جوش کو اعتدال کے اندر رہنے پر مجبور کرے تو جوش اسے اپنے آپ پر ناروا قدغن سمجھ کر قافلے سے الگ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس رفتار کے ساتھ آگے بڑھنا پسند نہیں کرتا جس رفتار کے ساتھ خرد آگے بڑھانا چاہتی ہے۔ اس آویزش میں بھی مختلف مقامات پر کسی تحریک کے قدم رکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں لیکن جس تحریک میں اخلاص ایک غالب عنصر کی حیثیت سے شامل ہو اس کے اندر ہوشمند قائدین اور پرجوش متبعین کے درمیان اعتدال کی راہ نکالنا کچھ مشکل نہیں ہوتا اور جلد ہی ایک ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے جس میں خرد اور جنون کے مابین مفاہمت پیدا ہو سکتی ہے۔ ہوش، جوش و جنون کی امنگوں کو سامنے رکھ کر اس کے لیے ایک معقول لائحہ عمل تیار

کرتا ہے اور اس معاملے میں اس کی فطری جولانیوں کا پورا خیال رکھتا ہے۔ دوسری طرف جنون بھی اپنے آپ کو بے لگام ہونے نہیں دیتا بلکہ راہِ توسط و اعتدال اختیار کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ خرد اور جنون کی اس مفاہمت سے تحریک میں قوت پیدا ہوتی اور قافلۂ انقلاب زیادہ مستعدی سے آگے بڑھتا ہے۔

قائد کی قیادت کا تدبر، اہلِ نظر سرپرستوں کا تجربہ و مشاہدہ اور نوجوانوں کا جوش و ولولہ۔۔۔ اس زادِ راہ کے ساتھ کوئی تحریک چوتھے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔ اور یہ مرحلہ اس کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس مرحلے میں اسے مخالف قوتوں کے ساتھ فیصلہ کن پنجہ آزمائی کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی تحریک اپنے نظم و ضبط، بلند حوصلگی اور صاحب فراست قیادت کی وجہ سے اپنے آپ کو داخلی انتشار سے بچا بھی لے تو وہ بیرونی یلغار سے بہرحال بچ نہیں سکتی۔ اس کی مخالف قوتیں اسے غیر مؤثر طاقت سمجھ کر کسی صورت بھی نظر انداز کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں بلکہ اس کا راستہ روکنے اور اس کا زور توڑنے کے درپے ہو جاتی ہیں اور اس کے وجود کو وقت کا سب سے بڑا خطرہ سمجھ کر اس کے خلاف پوری قوت سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔

ان مخالفتوں کی نوعیت بھی بڑی پیچیدہ اور ان کے میدان بڑے مختلف ہیں اور ان کا سب سے خوفناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ یہ مخالفتیں اپنے اپنے دائروں میں بھی تحریک کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں اور اس کام کے لیے اپنے آپ کو مجتمع بھی کر لیتی ہیں اور اگر وہ ضرورت محسوس کریں تو کسی ملک کی اندرونی قوتوں سے نہیں، بلکہ باہر کی قوتوں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں اور اسی طرح تحریک کی بڑھتی ہوئی طاقت کو منتشر کرنے کے لیے پورا زور صرف کر دیتی ہیں۔ اصل صورتِ حال سے بے خبر لوگ تحریک کے کارکنان، ہمدردوں اور دوسرے خیرخواہوں سے بڑے استعجاب کے ساتھ بار بار یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر ایک دنیا تمہاری مخالفت پر کیوں کمربستہ ہو گئی ہے؟ یہ سوال بذاتِ خود اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان حضرات کو نظریات و افکار کی غیر معمولی اثر آفرینی اور قوت کا کچھ اندازہ نہیں اور انہیں اس

(باقی بر صفحہ ۴۸ پر)